جدید اور ہم عصر ریاستوں کے مقابلے میں خلافت راشدہ کی انفرادیت - ایک تجزیہ

Uniqueness of the Caliphate in Past and Modern Perspective

☆ ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

During the Dark middle ages of Europe, The Holy Prophet Muhammad (PBUH) established the first ever Islamic state, in the Arab soil, at Medinah. The successors of the Prophet, known as Khulfa-i- Rashideen (the Glorious Caliphs) not only maintained it rather they extended with further development. The Caliphate was not only a model state for the world but also a unique one with respect to its political appratus, principles and the governance. This paper discovers the same uniqueness of the Caliphate in past and modern perspective.

رسول خدا جناب محمد مصطفی ﷺ نے مدینہ میں ۶۲۲ء میں، جو ریاست اسلامی قائم کی تھی وہ دس سال کے عرصہ میں ایک غیر معمولی رفتار کے ساتھ مثالی وسعت اختیار کرتی گئی۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ کے، اس ریاست میں دس سال تک، اوسطاً ۲۷۴ مربع میل روزانہ کے حساب سے اضافہ ہوتا رہا۔(۱) آپ ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد، ۶۳۲ء سے اس ریاست نے خلافت راشدہ کے نام سے ترقی پانا شروع کی۔ اردگرد کی، جبر واستبداد پر قائم ریاستیں اور ان سے تنگ آئے ہوئے معاشرے، سال بہ سال، خلافت راشدہ کا حصہ بنتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اسلامی ریاست دنیا کے تین براعظموں تک اپنے اثرات رکھنے والی ایسی ریاست بن گئی جس کا رقبہ ۳۰ لاکھ مربع کلومیٹر سے تجاوز کر گیا۔ ایک صدی میں ہی مسلمان اتنی بڑی سلطنت کے مالک بن گئے جو سلطنت روما سے کہیں بڑی تھی جو بحر قلزم کے ساحلوں سے لے کر چین کی سرحدوں تک وسیع تھی۔

☆ صدر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ خواتین WISH، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

اس حقیقت کو فلپ حتی (Philip K. Hitti) نے یوں تسلیم کیا ہے:

Within a century after their rise, this people became the masters of an empire, extending from the shores of the Atalantic Ocean to the cinfines of China, an empire greater than that of Rome at its zenith.(۲)

جمہوریت اگر اقتدار میں عوامی نمائندگی، شوریٰ و مشاورت، حقوق و فرائض کی ادائیگی اور آزادیٔ رائے کا نام ہے تو خلافت راشدہ سے بڑی اور نمایاں کوئی جمہوری ریاست، دنیا نے کبھی نہیں دیکھی۔ مغرب کی ترقی یافتہ جمہوریت، جو اقدار صدیوں کے ارتقائی سفر کے بعد بھی، انسانی معاشروں کو عطا نہیں کر سکی، خلافت راشدہ نے ساتویں صدی عیسوی میں ہی دنیا کو دکھا دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشروں کی اکثریت نے خلافت اسلامی کی سربراہی قبول کرتے ہوئے جابر سلطانوں کی غلامی کے طوق اتار پھینکے۔

* صدر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ خواتین WISH، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

آئندہ صفحات میں ہم ان تاریخی حقائق کا تحقیقی مطالعہ کریں گے، جن کی بدولت خلافت راشدہ، اپنی ہمعصر ریاستوں سے منفرد تھی اور آج تک کے انسانی معاشروں کے لیے ایک مثالی نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

خلافت کی سب سے پہلی اور اہم انفرادیت تو خود خلافت کی اصطلاح ہے۔ دنیا میں زمینی حاکمیت کے لیے ہمیشہ حکومت کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جو اپنے اندر طاقت اور تحکم کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ خلافت کے لفظ میں نیابت، جانشینی اور امانت کے مفاہیم شامل ہیں، طاقت اور تحکم کا کوئی پہلو اسکے فلسفے کا حصہ نہیں۔ خلافت کی منفرد اصطلاح، تاریخ اسلام میں رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے ساتھ مخصوص ہے اور اس سے مراد دین و دنیا کے معاملات میں رسول خدا ﷺ کی نیابت ہے۔

ادارہ خلافت، رسول خدا ﷺ کے بعد سقیفہ بنو سعد میں اس وقت معرض وجود میں آیا جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں نے اپنا سربراہ منتخب کیا، اور جب آپؓ کو خلیفۃ اللہ کے نام سے پکارا گیا تو آپ نے فوراً تصحیح کی کہ ''میں خلیفۃ الرسول ﷺ ہوں۔(۳)

جناب رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے لئے خلافت کا لفظ خود رسول خدا ﷺ کی احادیث سے ماخوذ ہے جن میں آپ نے خلافت کے زمانہ تک کی تخصیص فرما دی تھی۔ ارشاد ہوا:

تکون النبوۃ فیکم ما شاء اللہ أن تکون ثم یرفعھا إذا شاء أن یرفعھا ثم تکون خلافۃ

علی منهاج النبوة فتكون ماشاء الله أن تكون ثم يرفعها إذا شاء الله أن يرفعها ثم تكون ملكا۔

(تمہارے درمیان نبوت رہے گی جب تک اللہ چاہے اور جب وہ چاہے گا اس کو اٹھانا، اٹھالے گا۔ پھر نبوت کے طریقے پر خلافت قائم ہو جائے گی، جو قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے۔ جب وہ چاہے گا اس کو اٹھانا، اٹھالے گا۔ پھر بادشاہت آجائے گی۔)

اسی طرح آپ ﷺ نے، دور خلافت اور اس حکومت کی نوعیت سے متعلق بھی پیش گوئی فرمادی:

الخلافة بعدي ثلاثون عاما ثم ملك بعد ذلك ---اور پھر فرمایا:

نبوة رحمة ثم خلافة و رحمة و في لفظ على منهاج النبوة ثم يكون ملك عضوض۔(۴)

(میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی پھر بادشاہت ہوگی اس کے بعد۔ نبوت رحمت ہوگی پھر خلافت نبوت کے قائم کردہ طریقے پر رحمت ہوگی پھر شدید قسم کی بادشاہت)

یادر ہے کہ اسلامی تاریخ میں ادارہ خلافت کے لئے امامت اور امارت کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر خلیفہ کو امام اور امیر المؤمنین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ الماوردی اور ابن خلدون نے خلافت اور امامت کا لفظ، نبی ﷺ کی نیابت کے لئے استعمال کیا ہے، اور یوں اسلامی حکومت کے مقصد وجود کو بھی واضح کر دیا ہے۔ الماوردی، امامت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

الامامة موضوعة لخلافة النبوة في حراسة الدين و سياسة الدنيا۔

تقریباً انہی الفاظ میں علامہ ابن خلدون نے، خلافت کی تعریف میں لکھا ہے:

الخلافة نيابة في حفظ الدين و سياسة الدنيا۔(۵)

(یعنی امامت قائم ہوتی ہے نبی کی نیابت کیلئے دین اسلام کی حفاظت اور دنیا کے نظم و نسق چلانے اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے)

یہاں یہ نکتہ بھی قابل وضاحت ہے کہ خلافت کی اصطلاح ''ریاست'' اور ''حکومت''......دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ تاہم صرف حکومت کی نشاندہی کرنے کے لئے لفظ امامت یا امارت بھی استعمال ہوا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لئے استعمال ہوتی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ

پہناتی ہے۔(۶)

الغرض خلافت کی اصطلاح ریاست کیلئے استعمال ہو یا حکومت کے لئے اس سے مراد نبی آخر الزماں کی نیابت و جانشینی ہے جس کا مقصد دین کی حفاظت، دنیا کی اصلاح اور انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ان اصولوں کی بنیاد پر جو کہ خود رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی روشنی میں رب کائنات کی براہ راست ہدایت کے تحت متعین کر دیئے ہیں ۔لھذا، اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت دراصل ہر اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی جانشینی، نیابت اور پیروکاری ہی کا نام ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے خلفاء کے ساتھ ''راشدین'' کا اضافہ اور آپ ﷺ کی جانشین حکومت کے لئے ''خلافت راشدہ'' کی اصطلاح در اصل قرآن کریم اور احادیث رسول ﷺ سے ماخوذ ہے۔ جناب رسول کریم ﷺ کے درج ذیل فرمان نے ان کے لیے یہ اصطلاح مخصوص کر دی:

عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين۔(۷)

(تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کے قانون کی اطاعت واجب ہے۔)

رشد اور راشد (جس کی جمع راشدین ہے) عربی زبان میں ہدایت اور راست روی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ لا قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج ......﴾(۸)

(دین میں جبر نہیں، ہدایت اور گمراہی یقیناً واضح ہو چکی ہے)

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ رشد کا لفظ، ہدایت اور راست روی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ رشد سے مراد ہی راہنمائی کا اعلیٰ اور کامل نمونہ ہے۔۔۔ایسی کامل راہنمائی جو دین ہی نہیں دنیا کے معاملات سے بھی تعلق رکھتی ہو اور نوامیس الٰہیہ کے مطابق ہو۔(۹)

گویا قرآن و حدیث کی روشنی میں، لفظ خلافت اور رشد کے الفاظ کی تشریح کے مطابق، خلافت راشدہ سے مراد ایسی راست رو اور ہدایت یافتہ حاکمیت ہے جو نبی کریم ﷺ کی نیابت میں قائم ہوئی۔اس لیے خلفاء راشدین کے مصداق صرف وہ خلفاء ٹھہرتے ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ کی براہ راست تربیت کا برسوں تک شرف حاصل رہا اور وہ مسلسل رسول اللہ ﷺ کی مجلس مشاورت کے رکن رہے، لہذا رسول ﷺ کے اسوہ حاکمیت کے امین بھی وہی ٹھہرے۔

اس تشریح سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت اسلامی اپنے مفہوم، تعریف اور حقیقت کے لحاظ سے ایک منفرد حکومت ہے؛ نہ تو اپنے زمانے میں اپنے جیسی کوئی اور مثال رکھتی ہے اور نہ نبی خاتم ﷺ کی بعثت کے بعد کوئی ایسا موقع آئے گا ایسی حکومت قائم ہو سکے۔

خلافت راشدہ نے اپنی اس انفرادیت کو دیگر کون کونسے حوالوں سے ممیّز و ممتاز رکھا، ہم ذیل میں تاریخی شواہد کی مدد سے واضح کرتے ہیں:

ا۔ جناب رسول اللہ ﷺ جب دار فانی سے راہی بقا ہوئے تو اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے دو طبقے، خدمت اسلام کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ انصار مدینہ، جنہوں نے اسلامی ریاست کے قیام اور ارتقاء کے لئے ہر طرح کی خدمت بروئے کار لائی اور مہاجرین مکہ، جنہوں نے دین اسلام کی خاطر، رسول خدا ﷺ کی مدد اور خدمت، ہر طرح کے حالات میں اور ہر طرح کی قربانی دے کر کی تھی۔ یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ کس طبقے کو دوسرے پر کس قدر فوقیت حاصل تھی تاہم یہ بات واضح ہے کہ السابقون الاولون کی فہرست میں مہاجرین مکہ ہی آتے تھے، جنہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی ان میں سے تھے، چنانچہ وفات رسول ﷺ کے فوری بعد 'سقیفہ بنو ساعدہ' میں ایک مجلس عام منعقد ہوئی جہاں اس امر کا فیصلہ ہونا تھا کہ رسول خدا ﷺ کا جانشین کون ہوگا؟

حدیث اور تاریخ کے آثار (۱۰) سے واضح ہے کہ یہ سقیفہ، قبیلہ انصار، خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کی ملکیت تھا جہاں انصار صحابہ حضرت سعد کو ہی اپنا خلیفہ بنانے کے لیے مشاورت کر رہے تھے۔ وہ اس شرط پر اپنے حق سے دستبردار ہو گئے کہ نائب رسول مہاجرین میں سے ہوگا اور مشاورت و شوریٰ میں اولیت انصار کو حاصل ہو گی۔ اس طرح باضابطہ بحث و تمحیص اور مشاورت کے ذریعے، مسلمانوں کے اس اجتماع نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ نائب رسول ﷺ حضرت عبد اللہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے۔ مجلس عام نے، معاہدۂ خلافت باقاعدہ طور پر منظور کیا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت کر کے اس کی توثیق کر دی۔

اسلامی تاریخ میں اس منفرد حکومت کا آغاز اسطرح سے ہوا کہ معاملات حکومت میں عوام کی نمائندگی اور مشاورت کو شامل کیا گیا۔ دور جدید کی جمہوری حکومتیں آج تک، خلافت کے اس اصول کو اپنانے کوشش کرتی ہیں۔ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ خلیفہ کا انتخاب نہ تو وراثت کی بنیاد پر ہوا نا ہی دولت اور قبائلی اثر و رسوخ کی بنیاد پر۔۔ یہ انفرادیت بھی خلافت کے حصے میں آئی جبکہ مشرق و مغرب میں آج تک سربراہ حکومت کے انتخاب

میں، عموماً انہیں قدروں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

تاریخی حقائق کے مطابق عہد خلافت راشدہ میں خلفاء کا انتخاب مسلمانوں کی رضامندی و مشاورت سے طے پاتا رہا اور امت مسلمہ کے اهل الرائے، اپنے میں سے بہترین شخص کو ہی خلیفۃ الرسول ﷺ کے طور پر منتخب کرتے رہے۔ یہ انتخاب موجودہ دور کے الیکشن سے کئی حوالوں سے مختلف تھا۔ اس انتخاب میں درج ذیل امور کو بنیادی حیثیت حاصل رہی:

ا۔ مشاورت برائے انتخاب،   ب۔ امت کی رضامندی،   ج۔ بیعت عمومی

اسی طرح جو عناصر، خلافت کے انعقاد میں خارج از تعامل رہے، وہ یہ تھے:

ا۔ خلافت کی خواہش یا امیدواری،   ب۔ حق وراثت کی بنیاد پر مطالبہ خلافت، یا

ج۔ مال اور تقرب کی بنیاد پر حصول خلافت کا تقاضا۔

نبی کریم ﷺ کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب مشاورت کے بعد ہوا اور بیعت عمومی مسجد نبوی میں ہوئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے سلسلہ میں خلیفہ وقت حضرت ابوبکرؓ نے عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم، کے علاوہ دیگر مہاجرین و انصار سے بھی مشورہ کیا، پھر مسلمانوں کے اجتماع عام میں حضرت عمرؓ کا نام پیش کر کے منظوری و رضامندی حاصل کی جس کے بعد بیعت عام ہوئی۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مشاورتی ادارہ تجویز کیا جسے آجکل کی سیاسی زبان میں Electoral College کہا جاسکتا ہے، جس میں حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنھم، شامل تھے۔ یہ لوگ صلاحیت و کردار کے لحاظ سے اعلیٰ و ارفع درجہ پر فائز تھے اور امت مسلمہ میں نمائندہ کردار Representative Character کے حامل تھے۔ ان افراد کی آراء اور تین دن کے مسلسل مشورہ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کا انتخاب عمل میں آیا اور مدینہ میں بیعت عام کا انعقاد ہوا۔

اسی طرح خلیفہ چہارم کے طور پر حضرت علیؓ بن ابو طالب کا انتخاب بھی مہاجرین و انصار کی نہ صرف رضامندی بلکہ اصرار پر ہوا اور انہوں نے اس وقت تک ذمہ داری نہیں سنبھالی جب تک مجمع عام میں بیعت عام منعقد نہیں ہوئی۔ (۱۱) شہادت عثمانؓ کے موقع پر کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو آپ نے اس رائے

کو اہل شوریٰ اور اہل بدر کے فیصلہ سے مشروط کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

انما هو لأهل الشورىٰ و أهل بدر، فمن رضى به أهل الشورىٰ و أهل بدر فهو الخليفة۔

(خلافت کا فیصلہ اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام پس وہ جس پر راضی ہوں وہی خلیفہ ہوگا)

اسی طرح آپ نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹے حضرت حسن کی نامزدگی سے احتراز کیا اور اس معاملے کو مسلمانوں کی رضامندی پر چھوڑ دیا۔ [۱۲]

اسلامی ریاست میں خلیفہ کے انتخاب میں خاندانی قرابت، مال کی فراوانی یا موروثی حق کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ خلفائے راشدین کے انتخاب میں جو چیز سب سے نمایاں طور پر پیش نظر رہی وہ متعلقہ فرد کی اہلیت، صلاحیت اور صالحیت ہے۔ دور حاضر کا معتبر مؤرخ ٹی۔ڈبلیو۔آرنلڈ (T.W. Arnold) لکھتا ہے:

There was certainly some form of election in the case of the first four Caliphs,...... in neither instance was there any question of hereditary succession, nor was the choice of either of these Caliphs influenced by considerations of relationship. [۱۳]

(پہلے چار خلفاء کی حکومت، یقیناً ایک انتخاب ہی کی شکل تھی۔ ان میں سے کسی ایک بھی مثال میں نہ تو وراثت حکومت کی بنیاد بنی اور نہ ہی رشتہ داری کو اس انتخاب میں اہمیت دی گئی۔)

سقیفہ بنو ساعدہ میں جو بحث وتمحیص ہوئی اس کی تفصیل پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام خلافت کے لئے تجویز ہونے میں بنیادی کردار اس بات کا تھا وہ امت مسلمہ کی امامت کے لئے اہل ترین فرد تھے۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کی وہ تقریر [۱۴] جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے شخصی و دینی شرف وعظمت کے موضوع پر تھی، آپ کے بطور خلیفہ منتخب ہونے کا جواز پیش کرتی ہے اور یہی آخر کار اس انتخاب کی بنیاد بھی بنی!

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے انتخاب میں بھی آپؓ کی اہلیت ہی بنیاد انتخاب تھی۔ یہ بات خلیفۂ اول کی اس تقریر سے ثابت ہے جو آپؓ نے مرض الموت میں صحابہ کے اجتماع میں کی۔ اور حضرت عمر فاروقؓ کے مزاج کے بارے میں، ایک صحابی کی رائے پر، آپؓ نے جو کچھ فرمایا وہ بھی قابل غور ہے، آپؓ نے کہا:

لئن سألني الله لأقولن: استخلف عليهم خيرهم في نفسي۔ [۱۵]

(اگر مجھ سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا تو میں عرض کروں گا خدایا! میں نے تیرے بندوں میں سے اس کو منتخب کیا ہے جو ان میں سے سب سے اچھا ہے۔)

۲۔ عہد خلافت راشدہ میں امامت وحکومت کو ایک ذمہ داری کے طور پر لیا گیا۔ نہ اس کی خواہش رکھی گئی، نہ اس کے حصول کے لئے کوشش کی گئی۔ موجودہ دور کے سیاسی نظاموں میں کے برعکس، اس عہدے کے لئے اپنے آپ کو اہل تر ثابت کرنے کی کوشش اور اس سلسلہ میں ذرائع ابلاغ کا استعمال قطعاً نظر نہیں آتا بلکہ اسے بارِ امانت سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو دور رکھنے کی خواہش اور کوشش کی گئی تاہم جس شخص پر یہ ذمہ داری عائد ہو گئی پھر اس نے اپنی تمام صلاحیتوں، توانائیوں، وقت اور مال کو، اسی میں کھپا دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد بھی کسب روزگار کے لئے اپنا کاروبار تجارت جاری رکھا، حتیٰ کہ حکومت کی طرف سے آپ کے لئے ایک عام آدمی کی آمدنی کے برابر وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔۔۔ مگر وفات کے وقت آپ رضی اللہ عنہ نے وصیت کر دی کہ ترکے میں سے سب سے پہلے وہ رقم نکال کر سرکاری خزانے میں جمع کروا دی جائے جو انہیں وظیفہ کے طور پر دی جاتی رہی۔ (یہ انفرادیت بھی خلافت ہی کا طرہ امتیاز بنی)۔

آپؓ کا اندازِ حکومت خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس اور کردار کا عملی ثبوت تھا۔ خلافت کے حقیقی مفہوم کے مطابق، خلافت ایک ذمہ داری، امانت اور خدمت کے تصور سے مزین ہے، جیسا کہ خلیفہ اول نے اپنے ابتدائی خطاب سے ہی واضح کر دیا۔ آپ نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

یـایها النـاس فانی قد ولیت علیکم ، لست بخیر کم فان أحسنت فأعینونی و ان أسأت فقومونی، الصدق أمانة و الکذب خیانة و الضعیف فیکم قوي عندي حتی أریح علیه حقه ان شاء الله ، القـوي منـکم ضعیف عندي حتیٰ أخذ الحق منه ان شاء الله۔۔۔ (اے لوگو مجھے تمہاری ذمہ داری دی گئی ہے، میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ پس اگر میں اچھے کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر برا کام کروں تو مجھے سیدھا کر دینا، سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے کمزور، میرے لیے قوی ہوگا جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلاؤں، اللہ کی مرضی سے۔۔۔ اور تم میں طاقتور میرے لیے کمزور ہے جب تک اس سے حق لے کے نہ رہوں، خدا کے حکم سے۔۔۔)

آپ نے یہاں تک فرمادیا کہ:

فاذا رأیتموني قد اسقمت فاتبعوني و ان زغت فقوموني ۔[۱۶]

(جب تم مجھے دیکھو کہ میں سیدھے راستہ پر چل رہا ہوں تو میری اتباع کرو اور اگر میں راہ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹھیک کردو۔)

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا تھا کہ کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے۔۔۔اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (۱۷) کے ایک خطبہ خلافت سے اسلامی حکومت کی اصولی بنیادیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں جس میں آپ نے فرمایا کہ تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کئے گئے تھے ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جن معاملات میں کوئی قاعدہ پہلے مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہل خیر کا طریقہ مقرر کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مستقل یہ طریقہ رہا کہ جب کوئی ایسا معاملہ پیش ہوتا جس میں اہل الرائے اور ارباب فقہ وبصیرت سے مشورہ کرنے کی ضرورت پڑتی تو مہاجرین وانصار کے منتخب لوگوں کو مدعو کرتے جن میں عمر، عثمان، علی، عبدالرحمٰن ابن عوف، معاذ بن جبل، ابی ابن کعب اور زید بن ثابت رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین جیسے لوگ شامل ہوتے، یہ وہ لوگ تھے جو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں مختلف مسائل میں مرجع انام سمجھے جاتے تھے۔ خلفائے راشدین کے پورے دور میں مجلس شوریٰ نے ہر اہم معاملے میں فیصلے کئے۔ یہ شورائیت کسی خاص علامتی ایوان تک محدود نہیں رہتی تھی بلکہ حقیقی آزادی رائے سے مزین، عوام کا یہ اختیار، عمل کے میدان میں ثابت ہوتا رہا۔

حضرت عمرؓ کا فرمان مشہور ہے:

لا خلافة الا عن مشورة ـ (۱۸)

اسی بنیاد پر ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں:

ان الامارة ما اؤتمر فيها و ان الملك ما غلب عليه بالسيف ـ (۱۹)

(امارت یعنی خلافت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ جس پر تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو۔)

تاریخ شاہد ہے کہ پورے دور خلافت میں شوریٰ کا ادارہ، ایک متحدہ ومتفقہ اجتماعیت کا ایسا ادارہ رہا کہ

جہاں ہر فرد بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے، اپنے ضمیر کے مطابق رائے کا اظہار کرتا اور حکومت کی کارکردگی پر بے لاگ تبصرہ کرنے کا مجاز ہوتا، اس کی رائے، عصر جدید کی سیاسی پارٹی بازی کے برعکس، کسی سیاسی مفاد اور طبقاتی وابستگی کی آلودگی سے بالاتر ہوتی جو بلا کم و کاست ایوان میں پیش ہو جاتی۔

۳۔ ریاست مدینہ کا نظام بنیادی طور پر مرکزی حکومت کا نقشہ پیش کرتا ہے جبکہ انتظامی تقسیم میں صوبائی نظام پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھا۔ حکومت کا سربراہ خلیفہ یا امیر المؤمنین کہلاتا جو بیک وقت سیاسی، معاشی اور دفاعی امور و اختیارات کا منبع تھا۔ خلافت راشدہ کی مرکزی حکومت میں حکام و عمال کے انتخاب میں حد درجہ احتیاط برتی جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی مسلسل نگرانی و خبر گیری کا اہتمام مستقل طور پر جاری رہتا۔ خلیفہ اول، ذاتی معاملات میں رفق و ملاطفت کا پیکر تھے مگر اجتماعی انتظامی معاملات میں کسی نرمی و لا پرواہی کے روادار نہ تھے۔

مرکز خلافت مدینہ منورہ تھا جہاں مرکزی شعبہ جات قضا، شوریٰ، افتاء، کتابت اور دفاع قائم تھے۔ مرکز سے عمال حکومت یا گورنر نامزد ہوتے اور پھر انہیں ایک سرکاری فرمان دیا جاتا جو ضروری ہدایات پر مشتمل ہوتا تھا۔

خلیفہ اول نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بطور گورنر تقرری پر فرمایا تھا:

انك فـي سبيل الله يسعك فيه الأذهان و التفريط و الغفلة عما فيه قوام دينكم و عصمة أمركم فلاتن و لا تفتر۔ (۲۰)

(تم خدا کی ایک ایسی راہ پر ہو جس میں افراط و تفریط اور ایسی چیزوں سے غفلت کی گنجائش نہیں، جس میں دین کا استحکام اور خلافت کی حفاظت مضمر ہے، اس لئے سستی اور غفلت کو راہ نہ دینا۔)

عمال تو کجا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے اوپر نکتہ چینی و احتساب کو عوام کی آزادی کا حصہ سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اتـق اللہ یــاعمر! (اے عمر! خدا سے ڈرو!) حاضرین میں سے ایک شخص نے اسے روکنا چاہا تو حضرت عمر نے اس سے فرمایا: (ترجمہ)

نہیں اسے کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں گے تو یہ بے مصرف ہوں گے اور ہم نہ مانیں گے تو ہم بے مصرف ہیں۔ (۲۱)

آپ اپنے ہر عامل سے عہد لیتے تھے کہ وہ ترکی گھوڑا استعمال نہ کرے گا، باریک کپڑا نہ پہنے گا، چھنا

ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازہ پر دربان نہ رکھے گا، اور ضرورت مندوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے ہر وقت گا۔ خلیفہ دوم کا یہ بھی مستقل طریقہ رہا کہ حج کے موقع پر اجتماع عام میں حکام کے خلاف شکایات سنتے اور ان کا ازالہ فرماتے۔ عمال اور افسران کے احتساب میں کبھی تامل سے کام نہ لیا۔ حضرت خالد بن ولید جیسے سپہ سالار کو ایک غیر ضروری انعام دینے کی پاداش میں اپنے عہدے سے معزول کر دیا۔ اسی طرح آپ کے احتسابی عمل سے ابوموسیٰ اشعری، سعد بن ابی وقاص، ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر حکام بھی نہ بچ سکے۔ (۲۲)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسی حلیم الطبع شخصیت خلافت کی ذمہ داری کے دوران میں اس معاملے میں کسی مصلحت کا شکار نہ ہوئی اور والی بصرہ کو شان و شوکت کے غیر ضروری اظہار و نمائش پر معزول کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکام کے معاملات پر کڑی نگاہ رکھی جب بھی کسی کو عامل مقرر کرتے تو اسے نہایت مفید اور بیش قیمت نصائح اور ہدایات سے نوازتے۔ آپ کے روزمرہ گشت سے کوئی اجنبی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اتنی بڑی اسلامی ریاست کا خلیفہ ہے جو اس کے سامنے اس حالت میں پھر رہا ہے کہ نہ شاہی لباس ہے اور نہ ہٹو بچو کی صدائیں! آپ نے خلافت سنبھالتے ہی صوبوں کے گورنر عوام کی شکایات کے ازالہ کی خاطر تبدیل کر دیئے۔ (۲۳)

خلافت راشدہ میں ریاست کے باشندے دو طرح کے تھے: مسلمان اور غیر مسلم، خلفائے راشدین نے اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو قانون سے بالاتر حیثیت نہیں دی بلکہ ایک عام شہری کی سطح پر رہ کر، رئیس مملکت کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اگرچہ قاضی کا تقرر خلیفہ وقت کے حکم سے ہوتا تھا مگر قضاۃ اپنے فیصلے صادر کرنے میں اس قدر آزاد ہوتے تھے کہ خود امیر المؤمنین کے خلاف مقدمات کی سماعت کرنے اور فیصلہ دینے میں ذرہ برابر نہ چوکتے۔

خلیفہ دوم ایک معاملے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے ہاں فیصلے کے لئے حاضر ہوئے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے بعد، مجلس کے اختتام پر فرمایا کہ زید، قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ عمر اور ایک عام مسلمان، ان کے نزدیک برابر نہ ہو۔

حضرت علیؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی گمشدہ زرہ، ایک عیسائی کو بازار میں بیچتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے خلیفہ ہونے کی بنیاد پر اس سے زرہ کے حصول کے لئے، سرکاری قوت اور اپنی حیثیت کا استعمال نہیں کیا بلکہ عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ قاضی نے بلا رو رعایت، خلیفہ کیخلاف فیصلہ دے دیا کیونکہ آپ اپنے

استغاثہ کے حق میں کوئی گواہ پیش نہ کر سکے تھے۔ایک مشہور روایت ابن خلکان نقل کرتے ہیں کہ ایک مقدمہ میں حضرت علی ایک غیر مسلم شہری کے ساتھ بطور فریق، قاضی شریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔قاضی شریح، امیر المؤمنین کے آنے پر احتراماً کھڑے ہو گئے تو حضرت علیؓ نے کہا کہ'' آپ نے پہلی بے انصافی تو یہی کی ہے!''۔(۲۴)

۴۔ اصول سیاست کے لحاظ سے دیکھیں تو بھی خلافت کے امتیازی اوصاف نمایاں نظر آتی ہے۔خلافت راشدہ نہ تو کسی فرد واحد کی مطلق العنانیت تھی اور نہ ہی کسی گروہ یا جماعت کی اجارہ داری، بلکہ عوام الناس کے 'رضا کارانہ عہد اطاعت' یعنی بیعت کی بنیاد پر قائم، جناب نبی کریم ﷺ کی وہ جانشینی تھی جس میں حاکمیت اعلیٰ یا اقتدار اعلیٰ، مالک الملک خدائے واحد کو حاصل تھا۔ لہٰذا خلافت، عوام الناس کی مرضی یعنی Gereral Will کی بجائے مالک حقیقی کی رضا یعنی Divine Will کے عملی نفاذ کی سیاسی حکمت عملی کا نام تھا۔

قدیم ریاستی نظاموں سے متعلق تاریخی شواہد کے وہ حوالے جو ہم نے گذشتہ صفحات میں دیئے ہیں، کے مطابق دنیا کی سیاسی تاریخ ایک ہی کشمکش کی روداد نظر آتی ہے، وہ یہ کہ حاکمیت اعلیٰ کے مالک عموماً بادشاہ کی شکل میں فرد واحد بنے رہتے ہیں اور ان کے جبر کے ردعمل میں عوام الناس اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہتے ہیں، یہی سیاسی چکر دائمی طور پر چلتا رہا ہے۔فرد واحد سے اقتدار اعلیٰ Ultimate/Absolute Authority لے کر عوام کی اکثریت کے ہاتھوں میں دیدیا جائے جسے، وہ خود یا اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے سے روبہ عمل لائیں تو یہ نظام 'جمہوریت' کا روپ دھار لیتا ہے۔

اس عوامی حاکمیت (Rule of People) کے مقابلے میں خلافت راشدہ میں جو نظام نظر آتا ہے وہ عوام کے مشورے اور رائے کے ساتھ ایسے حاکم کا انتخاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کو ریاست میں اس طرح نافذ کرتا ہے، جس طرح اس نے نبی آخر الزماں ﷺ کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔اگر یہ حاکم ایسا نہ کرے تو اسے اسلامی تعلیمات کی اصطلاح میں بادشاہ یا باغی تو کہا جا سکتا ہے خلیفہ نہیں۔اس اصول کے مطابق دور خلافت راشدہ میں نظام حکومت و سیاست سے ثابت کیا گیا کہ اقتدار اعلیٰ کی مالک، خالق کائنات کی ہستی ہے۔ریاستی حاکمیت، کسی انسان کے پاس اصل مالک کی طرف سے امانت کے طور پر سپرد ہوتی ہے اور وہ اس اختیار کے سلسلہ میں اپنے رب کے سامنے ہی جوابدہ ہے۔

اس حقیقت کی مکمل وضاحت، خلفائے راشدین کیطرف سے، انتخاب خلافت کے موقع پر دیے گئے ،خطبات میں موجود ہے اور ان خلفاء کے طرز حکومت، اسی اصول کا منہ بولتا عملی ثبوت ہیں۔ مثال کے طور پر خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے یہ الفاظ کہ:

اطیعوني ما اطعت اللّٰہ و رسولہ فاذا عصیت اللّٰہ و رسولہ فلا طاعة لي علیکم۔

اسی طرح خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اہل مصر کے نام (قیس بن سعد کی تقرری بطور گورنر کے موقع پر) سرکاری فرمان، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاضی شریح سے یہ فرمانا کہ:

اقض بما استبان لك من کتاب اللّٰہ۔[۲۵]

قدیم یونانی جمہوریتوں میں مذہب کا کسی نظام سیاسی کے طور پر کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ اگرچہ سیاسی نظریات میں فلاسفہ اور مفکرین کے خیالات کو بڑا دخل تھا اور ان تصورات میں قدیم انبیاء کی تعلیمات کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ تاہم وہ ریاستی نظام جو بعد میں جمہوریت کے روپ میں سامنے آیا، حکومتی سطح پر مذہب کے کردار کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ البتہ روم میں، دور وسطیٰ میں مذہب نے اقتدار کے زینے عبور کئے اور قدیم نظریۂ بادشاہت الوہی Divine Kingship پھر سے حاوی ہوگیا۔ بادشاہوں نے مذہب کا استعمال، اپنے اقتدار کو مؤثر اور وسیع کرنے کے لئے کیا۔

عیسائیت کا مذہب اور انکی مقدس کتاب انجیل میں، ریاست کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی شعبہ ہائے زندگی کے لئے ٹھوس نظام موجود نہیں تھا۔ لہذا بادشاہت کے ساتھ اس مذہب کے گٹھ جوڑ نے، لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہونے کے علاوہ کوئی مثبت اور تعمیری کام نہ کیا۔ لہذا مذہب اور سیاست یعنی کلیسا اور شہنشاہت کے تصادم کے نتیجہ میں سلطنت روما پارہ پارہ ہوگئی۔

مدینہ کی اسلامی ریاست جو خلفائے راشدین کے دور میں دنیا کے تین براعظموں میں اپنے اثرات پھیلا چکی تھی، مکمل طور پر مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے اور نشونما پانے والی ریاست تھی۔ اس ریاست کی بنیاد ہی مذہب اسلام کو مکمل کرنے والے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ لہذا یہاں ریاست و مذہب ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ دین اسلام محض پوجا پاٹ کے چند طریقوں کا مجموعہ نہیں تھا بلکہ اس نے تمام شعبہ ہائے زندگی کے لئے اصول وضوابط مہیا کئے تھے۔ لھذا، دین وسیاست میں تفریق کی بجائے، ریاست وسیاست اور تہذیب وتمدن کی بنیادیں، جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب اسلام کے اصولوں پر اٹھائی تھیں۔

خلافت اسلامیہ کے دارالخلافہ میں، خلیفہ وقت بیک وقت، بطور سربراہِ مملکت، بطور چیف جسٹس، بطور سپہ سالارِ اعظم اور بطور امام الصلاۃ کام کرتا تھا۔

مدینہ کی اسلامی ریاست اس لحاظ سے دنیا کی منفرد ریاست ہے کہ وہ رسول خدا ﷺ کے ہاتھوں قائم ہوئی۔ اس ریاست کے قیام میں، رسول خدا ﷺ کی دعائیں، اور جدوجہد، خدائے یکتا کی رضا و نصرت اور عوام کی رغبت کا بنیادی کردار تھا۔ گویا یہ ایک انسانی معاشرے کا اپنے رب کے ساتھ، رسول خدا ﷺ کے ذریعے قائم ہونے والا، رضا کارانہ سماجی معاہدہ تھا جو پاکیزہ مقاصد کی بنیاد پر استوار رہا اور پاکیزہ نتائج پر منتج ہوا۔

۵۔ انسانی معاشروں کے اجتماعی معاملات کو چلانے کیلئے ہمیشہ سے حکومتی مشینری میں عوامی نمائندگی یا عوام کی شرکت کا کوئی نہ کوئی اصول وطریقہ کارفرما رہا ہے۔ قدیم قبائلی جمہوریت میں قبائلی سردار سیاسی حاکمیت کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ عوام الناس کی نمائندگی ایسے افراد کو ملتی رہی جو کسی بھی حوالے سے معاشرے کے نمایاں افراد ہوتے۔ بدلتے تقاضوں اور ضروریات کے تحت اس نمائندگی کے اصولوں اور طریقوں میں فرق آتا رہا ہے۔ تاہم جب بھی جبر کے ذریعے کسی فرد واحد کی حکومت قائم ہوئی تو لوگوں نے جلد یا بدیر اس سے آزادی کی جدوجہد شروع کر دی اور یوں جمہوری رویوں کا سفر جاری رہا۔

خلافت اور جمہوریت کے طرز ہائے حکومت میں، عوامی نمائندگی کے اصول، عملاً دو پہلوؤں سے، بالکل مختلف ہیں:

ا۔ جمہوری ریاست میں عوام کی اکثریت کی رائے اور رویے سے، حلال وحرام، جائز و ناجائز اور حق و باطل کے بنیادی فیصلوں تک کو تبدیل کیا جا سکتا ہے جبکہ خلافت میں عوام الناس کی سو فیصد اکثریت بھی ایسے بنیادی فیصلے کرنے کی مجاز نہیں ہے جو شریعت کے خلاف ہوں اور نہ ہی یہ اختیار عوام کے نمائندوں یا حکمرانوں کو کسی بھی قیمت پر حاصل ہو سکتا ہے۔ تاہم اجتماعی معاملات میں عوام کی شرکت کا پہلو، نظام خلافت میں اس قدر اہم ہے کہ خود خلافت کا انعقاد ہی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ لوگ بیعت عام کے ذریعے اس کی تائید نہ کر دیں۔

اسلامی تعلیمات میں ایسی حکومت، ملوکیت یا Autocracy ہے جو بیعت کے بغیر قائم ہوئی ہو۔ خلافت منعقد Establish ہی بیعت کے ذریعے ہوتی ہے اور مشاورت و شوریٰ کی بنیاد پر چلتی اور قائم رہتی ہے۔

ب۔ 'عوام' سے مراد قدیم شہری ریاستوں میں مرد شہریوں پر مشتمل وہ 'خواص' تھے جنہیں 'شہری' کہا جا سکتا تھا۔ معاشرے میں آزاد آبادی کا نصف یعنی طبقۂ خواتین، حقوق شہریت سے محروم ہوتا تھا جبکہ 'غلام' کسی گنتی میں نہیں آتے تھے حالاں کہ ان کی تعداد ہر ریاست میں 'شہریوں' سے کئی گنا زیادہ ہوتی تھی۔ اسلامی خلافت میں ایسی طبقاتی تقسیم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ عوام یا جمہور سے مراد مسلمانوں کی اجتماعیت تھی جس میں کسی کو اس کی معاشی حالت اور سماجی مقام کی بنیاد پر کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔ یہاں شہری حقوق کے لحاظ سے تمام برابر تھے۔

عہد خلافت راشدہ سے پہلے کی تمام انسانی تہذیبیں خواہ مصر، ایران، روم اور ہندوستان کی وسیع شہنشاہتیں ہوں یا یونان کی چھوٹی چھوٹی 'جمہوریتیں'۔ مساوات انسانی کے اصول سے ہمیشہ نا آشنا رہیں۔ اسلامی خلافت میں ان ریاستوں کی طرح حاکم ومحکوم، فاتح ومفتوح، امیر وغریب، سفید وسیاہ، آزاد وغلام اور کثیر وقلیل کی بنیاد پر قائم کوئی طبقاتی معاشرہ نظر نہیں آتا۔ یہاں فارس سے آنے والا سلمان شوریٰ کا اہم رکن بن سکتا ہے اور حبشہ سے آنے والا غلام 'سیدنا بلال' (ہمارا سردار بلال) کہلواتا ہے۔

خلافت راشدہ میں خلیفہ وقت کے لئے ہمعصر ریاستوں کے مقابلے میں، کوئی علیحدہ قانون نہیں تھا بلکہ وہ عوام الناس کی طرح عدالت میں بوقت ضرورت سائل اور مسئول کے طور پر حاضر ہوتا تھا۔ اس سے بڑھ کر قانونی مساوات کیا ہوگی کہ خلیفۂ چہارم، قاضی شریح کی عدالت میں ایک ذمی کے ساتھ ایک فریق کے طور پر حاضر ہوتے ہیں اور قاضی کے تکریم خلیفہ میں اٹھ کھڑے ہونے کو 'ناانصافی' قرار دیتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر معاشرتی مساوات کا مظاہرہ کس طرح ہوگا کہ خلیفۂ دوم جب بیت المقدس کے فتح کے موقع پر معاہدہ کے لئے یروشلم گئے تو سواری پر آدھا سفر آپ نے اور آدھا آپ کے غلام نے کیا۔[۲۶]

اس سلسلہ میں اسلامی طرز حکومت اور جمہوری نظام سیاست کے فرق کو شاہد حسین رزاقی نے یوں واضح کیا ہے کہ:

یونان کی شہری مملکتوں میں جمہوریت کو انتہائی فروغ حاصل ہوا لیکن ایتھنز جیسے ترقی یافتہ جمہوریہ میں بھی عورتیں حقوق سے محروم تھیں اور آبادی کی عظیم اکثریت ایسے غلاموں پر مشتمل تھی جو نہ صرف سیاسی بلکہ انسانی حقوق تک سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ یہی حال دوسری ریاستوں کا تھا چنانچہ یونانی جمہوریت کا تاریک پہلو معاشرتی مساوات کا فقدان تھا۔ یونانی اور رومن جمہوریت کی ان خامیوں کو اسلام کے جمہوری حقوق اور معاشرتی مساوات کے تصور نے دور کیا اور اپنے ان اصولوں کو عملی شکل میں نافذ کیا جو موجودہ جمہوریت کے

بنیادی اصول تصور کیے جاتے ہیں۔[۲۷]

۶۔ خلافت اسلامی نے اپنی رعایا کو جن بنیادی حقوق سے بہرہ مند کیا، ان کے عنوانات درج ذیل بنتے ہیں:

جان، مال اور عزت و آبرو کا تحفظ۔ سماجی، معاشی اور قانونی مساوات۔ مذہب، سکونت اور اظہار خیال کی آزادی۔ عدل، تعلیم اور وسائل زندگی کی فراہمی۔ قانون وراثت، عورت کے معاشی حقوق اور سماجی مرتبے کا تحفظ اور انسداد غلامی۔۔۔ انفرادی سطح پر افراد معاشرہ کو حریت و مساوات کا تحفہ اور اجتماعی سطح پر سیاسی و معاشی ظلم واستیصال سے نجات۔۔۔

یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہوا جب انسانی سماج، ابھی اپنے بنیادی حقوق کا شعور ہی حاصل نہ کر پایا تھا اور حقوق کی کوئی واضح فہرست بھی مرتب نہیں ہوئی تھی۔

خلیفہ اول نے اپنی پہلی تقریر میں ہی حقوق کی ادائیگی کا عہد اس انداز میں کیا کہ:

الضعیف منکم قوي عندی حتیٰ أزیح علیه حقه ان شاء اللّٰه، و القوي منکم ضعیف عندي حتیٰ أخذ الحق منه ان شاء اللّٰه۔[۲۸]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عمال کو ہدایت کرتے ہیں کہ: (ترجمہ)

تم ان (اپنی رعایا) کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک نہ بن جاؤ۔ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کا ہر فطری حق چھین لے۔[۲۹]

خلفائے راشدین کے طرز حکمرانی کے اس پہلو کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں کہ:

یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطہ سے نہ کرتے تھے بلکہ براہ راست ہر روز پانچ مرتبہ نماز باجماعت میں، ہر ہفتے جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں ان کو قوم سے اور قوم کو ان سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ان کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب و دربان کے بغیر ان کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے اور ہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ ان تمام مواقع پر ہر شخص کو انہیں ٹوکنے، ان پر تنقید کرنے اور ان سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی اور اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت نہ دیتے تھے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔[۳۰]

مسلم رعایا تو ایک طرف، غیر مسلم شہریوں کے ساتھ رواداری اور انسان دوستی کا اظہار خلافت راشدہ کا

طرۂ امتیاز رہا ہے:

ا۔ خلیفہ اول کی طرف سے اہل حیرہ کے ساتھ معاہدہ میں یہ باتیں شامل تھیں کہ:

لا يهدم لهم بيعة و لا كنيسة و لا قصرمن قصورهم التي كانوا يتعضون اذا أنزل بهم عدو لهم و لا يمنعون من ضرب النواقيس و لا من اخراج الصبيان في عيدهم۔

ب۔ اسی طرح جو ذمی بوڑھے، اپاہج اور مفلس ہو جاتے نہ صرف ان کا جزیہ معاف ہو جاتا بلکہ اسلامی ریاست کا بیت المال ایسے لوگوں کی کفالت کا ذمہ دار ہو جاتا۔

ج۔ خلیفہ ثانی کے دور خلافت میں جنگی حکمت عملی کے تحت، حمص کا مفتوحہ علاقہ مسلمانوں نے خالی کر دیا اور پورے علاقے میں، غیر مسلموں سے لیا ہوا جزیہ واپس کر دیا گیا۔ اس بنیاد پر کہ جزیہ انکے تحفظ کے بدلے میں وصول کیا گیا تھا۔ اب چوں کہ مسلمان اس مفتوحہ علاقے کو چھوڑ رہے ہیں، یہ علاقہ مسلمانوں کی عملداری میں نہیں ہوگا اور وہ عوام کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ لھذا وہ جزیہ اپنے پاس رکھنے کے حقدار نہیں۔ انصاف اور حسن سلوک کی اس روایت پر، عیسائی اور یہودی نہ صرف حیران ہوئے بلکہ مسلمانوں کی دوبارہ فتح اور آمد کیلیے دعائیں کرتے رہے۔(۳۱)

۷۔ خلافت راشدہ سے پہلے قائم شدہ ریاستیں عموماً ایک خاص قومی عصبیت پر قائم ریاستیں تھیں جبکہ خلافت اسلامی، وطن، رنگ، نسل، قوم اور قبیلہ کی عصبیتوں سے پاک ایک ایسی نظریاتی ریاست تھی جو دیگر مذاہب اور نظریہ ہائے زندگی کے ساتھ پر امن بقائے باہمی کے اصولوں پر چلتی رہی۔ خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں حق سچ کے قبول ورد کا انحصار بھی قبائلی عصبیت پر ہو اور نبی کو ماننا اور نہ ماننا بھی قبیلے کی بنیاد پر ہو۔۔۔ خلفائے راشدین نے بے لاگ اور غیر متعصّبانہ طریقے سے نہ صرف تمام عرب قبائل بلکہ غیر عرب نو مسلموں کے ساتھ وہ منصفانہ برتاؤ رکھا جو آج تک بے مثل ہے۔

خود اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کے ساتھ خصوصی سلوک سے نہ صرف اجتناب برتا گیا بلکہ سوائے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے (جنہوں نے معیار اور کردار کو سامنے رکھ کر اپنے قبیلے پر زیادہ اعتماد کا اظہار کیا) ہر ایک خلیفہ نے اپنے خاندان اور قبیلے کو حکومتی عہدوں اور مراعات سے قطعاً دور رکھا۔ اس سلسلہ میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی وہ ہدایت قابل توجہ ہے جو آپ نے آخری وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (تینوں ممکنہ خلفاء) کو بلا کر دی تھی کہ:

اگر میرے بعد تم خلیفہ بنو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔(۳۲)

خلافت ایک ایسی ریاست تھی جس میں عوام کی خدمت اور حقوق کی ادائیگی کی خاطر خلیفہ، اپنے اختیارات امانت تصور کر کے کا استعمال کرتا، اس احساس ذمہ داری کے ساتھ کہ اسے خالق حقیقی کے سامنے پیش ہو کر اس کا جواب دہ ہونا ہے۔ خلافت راشدہ کی معاصر ریاستیں خواہ وہ یونان وروما کی قومی ریاستیں ہوں یا چین و ایران کی شہنشاہتیں۔۔۔۔ایسے کسی بھی رویے اور اہتمام سے دور تھیں۔ وہ یا تو قومی، نسلی اور وطنی عصبیت پر قائم تھیں یا مطلق العنان بادشاہتوں کے تحت مخصوص افراد اور خاندانوں کی ملکیت بنی ہوئی تھیں۔

قانون کی عملداری اور عدل وانصاف کی فراہمی بھی کسی طرح کی گروہی اور مذہبی عصبیت سے بالاتر تھی۔ اس سلسلہ میں خلیفہ چہارم علی مرتضیٰ کی مسروقہ زرہ والا واقعہ قابل ذکر ہے جس میں آپ نے ایک ذمی (غیر مسلم شہری) کو وہی زرہ بازار میں بیچتے دیکھ لیا اور عدالت سے رجوع کیا جہاں وہ اپنے حق میں گواہی پیش نہ کر سکنے پر اپنی زرہ، مذکورہ عیسائی سے واپس نہ لے سکے۔۔۔۔۔۔ نہ تو خود خلیفہ وقت نے کسی تعصب میں مبتلا ہو کر اپنے اختیارات کا استعمال کیا اور نہ ہی قاضی نے کسی ایسے جذبے کی بناء پر غیر مسلم کے خلاف فیصلہ دیا۔ اسی مذہبی رواداری کا ثبوت اس تاریخی معاہدے سے بھی ملتا ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتح بیت المقدس جنوری ۶۳۷ء) کے موقع پر مسلمانوں نے دیگر اقوام اور مذاہب کے ساتھ کیا۔(۳۳)

۸۔ خلافت راشدہ اس ریاست الٰہیہ کے تسلسل کا نام تھا جس کا آغاز نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات کے تحت کیا تھا۔ دنیا کو پہلے تحریری دستور ریاست 'میثاق مدینہ' تیار کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حاکمیت قائم کی۔ لہذا اس ریاست کا دستور وآئین آخری الہامی کتاب قرآن مجید پر مبنی تھا۔

اس دستور میں نہ تو یونانی جمہوریتوں کی طرح عوامی خواہشات کا گورکھ دھندا اور اکثریت کا جبر Tyranny of Majority تھا اور نہ ہی ایران، روم اور چین و ہندوستان کی طرح آئین و دستور سے ماوراء بادشاہ کی بے لگام مرضی کا قانون۔۔۔۔ یہاں بادشاہ کے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے اور نہ ہی عوام الناس کی خود غرضانہ خواہشات قانون پر حاوی تھیں۔ یہ خالق کے عطا کردہ راہنما اصولوں کی، رسول خدا کی طرف سے کی گئی عملی تشریح کے مطابق، خدا ترس لوگوں کا، عوام کی اجتماعی فلاح پر مبنی، ایک ایسا منشور Manifesto تھا، جس کی ہر شق خوف خدا اور خدمت خلق کے اصولوں سے مربوط تھی۔

خلافت اسلامی میں اقتدار کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے دیئے آئین میں حلال وحرام،

حق و باطل اور حقوق و فرائض کا فیصلہ موجود ہے۔اس ضابطے کی پیروی ریاست میں حاکم ومحکوم اور خلیفہ و رعایا سب کے لئے یکساں طور پر لازمی ہے لہذا اس ریاست میں دستوری جمہوریت کے تحت ایک 'امین' حکومت قائم ہوتی ہے جو دستور الہی نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اور خدا کے سامنے جوابدہ بھی۔۔۔وہ خلق خدا کے حقوق کی پاسبانی کے لئے رب اعلیٰ کے اقتدار کو نافذ کرنے کی مکلّف ہے۔لہذا ایسی حکومت اپنے بنیادی دستور کے لحاظ سے خودسر اور مطلق العنان نہیں ہوسکتی۔یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اول اپنے عوام سے یہ کہتے ہیں کہ:

فان احسنت فاعینوني و ان ساء ت فقوموني ---و اطیعوني ما اطلعت اللّٰہ و رسوله فاذا عصیت اللّٰہ و رسوله فلا طاعة لي علیکم ۔[۳۴]

عہد خلافت راشدہ کا مطالعہ بتایا ہے کہ ایک اسلامی مملکت خاص مقصدیت کی حامل ریاست ہوتی ہے۔جغرافیائی سرحدیں، ہجوم انسانی اور حاکمیت انسانی ، اسکا مقصود و مطلوب نہیں بلکہ اس ریاست کا مقصد منشائے الٰہی کے مطابق انسانی معاشرے کی اصلاح اور فلاح ہے۔اس مقصد وجود کو پورا کرنے کے لئے ،خلافت راشدہ کی پوری حکومتی مشینری 'امر بالمعروف و نهی عن المنکر ' کے مرکز ومحور پر یکسو رہتی تھی۔

ریاستیں عموماً عوام الناس کی اخلاقی تربیت کے معاملہ میں لاپرواہ اور غیر جانبدار ہی رہتی ہیں ۔ جمہوری ریاست کا تو تصور ہی لوگوں کی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔وہ عوام کی اخلاقی حالت کی نگرانی اور معاشرتی زندگی میں تبدیلی کی مجاز نہیں ہوتی۔جبکہ خلافت اسلامی کی بنیادی ذمہ داری ہی افراد معاشرہ میں اچھائیوں کو فروغ دینا اور برائیوں سے دور رکھنا ہوتا ہے۔

خلافت راشدہ کی حکومت کو اس مقصدیت نے اس دور کی دیگر تمام ریاستوں سے منفرد نوعیت کی ریاست میں تبدیل کر دیا تھا جس کی خارجہ پالیسی میں بھی یہی مقصد نمایاں تھا۔یہ مقصد ایک ہمہ گیر وسعت رکھتا ہے جسکی تکمیل کے لحاظ سے ،وہ کسی خاص قبیلہ،قوم اور وطن تک محدود نہیں رہ سکتی۔۔وہ ہر دم وسعت پذیر ہوتی ہے مگر اس کی توسیع مذکورہ بالا مقصد کی خاطر ہی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کی توسیع کسی انتقام،کسی قومی عصبیت،معاشی اقدام اور ملکی سرحدوں میں اضافہ کو بنیاد بنا کر نہیں ہوئی بلکہ انسانیت کو ظلم و جہالت سے نجات دلانے اور صلاح و فلاح سے روشناس کروانے کی خاطر ہی ہوئی۔

خلافت اسلامی کا دیگر ریاستوں سے دوستی اور دشمنی کا معیار یہی دو اصول رہے: ظلم و استیصال سے پاک معاشرہ اور انسانیت کی اصلاح و فلاح۔

اس انفرادیت کا اظہار سفارت کاری کے ساتھ ساتھ معرکہ آرائی میں بھی یوں ہوتا رہا کہ ہر جنگ سے پہلے اسلامی فوج، مخالف حکومت و ریاست میں مقاتلین (یعنی لڑنے والے، فوجی) اور غیر مقاتلین (عام شہری) کو علیحدہ کر لیتی۔

عورتوں، بچوں، معذوروں اور مذہبی پیشواؤں سے تعرض نہ کرتی۔ پھر اہل جنگ کو بھی پہلے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جاتی۔ اگر یہ شرط نامنظور ہوتی تو جزیہ دے کر عدل و انصاف پر مبنی اسلامی معاشرے کا حصہ بن جانے کی ترغیب دی جاتی۔ اگر یہ شرط قبول نہ کی جاتی تو پھر تلوار کو فیصلے کی بنیاد بنایا جاتا۔

قوت کے استعمال اور معرکہ آرائی کے اصولوں کے اعتبار سے بھی خلافت اسلامی نے انسانیت کو پہلی بار، مقاصد جنگ کی پاکیزگی اور آداب جنگ کی انقلابی اصلاحات سے روشناس کروایا۔

خلافت راشدہ کے ابتدائی دور سے ہی روم و ایران کی سلطنتوں نے جب اسلامی ریاست میں انتشار کی حوصلہ افزائی کی تو خلیفۂ اول نے دفاعی حکمت عملی کے تحت، اس فوجی کارروائی کو جاری رکھنے کا حکم دیا جس کی تیاری خود رسول خدا ﷺ کی ہدایت سے ہو چکی تھی، مگر اپنی فوج کو یہ حتمی ہدایات دیں:

خیانت نہ کرنا، دھوکہ نہ دینا، امیر کی نافرمانی نہ کرنا، کسی شخص کے اعضاء مت کاٹنا، کسی بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا، کھجور یا کسی پھلدار درخت کو مت کاٹنا۔۔۔عبادت گاہوں میں مصروف لوگوں سے تعرض نہ کرنا۔ (۳۵)

اب اس سے بہتر خارجہ اور دفاعی پالیسی اور کیا ہوگی کہ غیر مسلموں کے مذہب اور معابد کا احترام، ان کے حقوق کی نگہبانی اور انصاف رسانی، ان کے ساتھ معاہدوں کی پابندی، ان کی خوشحالی کی ضمانت اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری اسلام نے قبول کی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور (اسلامی یونیورسٹی بہاولپور۔۱۴۰۱ھ): ۱۷۹
ایضاً، رسول اکرم کے میدان جنگ: (مکتبہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن): ۷

۲۔ *History of The Arabs* (New York-1968),p:3

۳۔ ابن خلدون، مقدمہ، منشورات، بیروت، ص۱۵۹۔

۴۔ احمد بن حنبل، مسند احمد، دار الاحیاء التراث العربی، بیروت۔۱۹۹۱ء، ج۵/ص۳۴۱ تا ۳۴۲

۵۔ الماوردی، علی بن احمد، الاحکام السلطانیہ، مصر۔۱۹۶۰ء، ص۵، مقدمہ ابن خلدون، ص۱۷

۶۔ امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست، انجمن خدام القرآن، لاہور۔۱۹۷۷ء، ص۱۵

۷۔ مسند احمد، ج۴/ص۲۷۳

۸۔ البقرۃ:۲۵۶، الحجرات:۷

۹۔ راغب اصفہانی، المفردات (دار الفکر بیروت۔۱۴۰۴ھ): ص۱۹۶
محمود آلوسی، روح المعانی (دار الفکر بیروت۔۱۹۹۷ء): ج۱۷/ص۸۶

۱۰۔ امام بخاری، صحیح البخاری (دار السلام، ریاض۔۱۹۹۷ء)
کتاب الاحکام، باب الاستخلاف: ۱۵۱۷
ابن سعد، طبقات (دار الفکر، بیروت۱۹۹۴ء): ۱۴۱/۳
ابو یوسف، کتاب الخراج (دار المعرفہ، بیروت۔۱۹۷۹ء): ۷۔۸

۱۱۔ ابن اثیر: الکامل (طباعۃ المنیریہ، دمشق۔۱۳۵۶ھ): ۳۲/۳، ابن سعد، طبقات: ۲۴۹/۳
ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ (منشورات الشریف الرضی، ایران۔۱۹۶۹ء): ۴۶/۱

۱۲۔ ابن سعد، طبقات: ۲۰/۳، ابن اثیر، الکامل: ۸۰/۳
المسعودی، مروج الذہب (مصر۔۱۳۴۶ھ): ۴۲/۲

۱۳۔ *The Caliphate, p*:22

۱۴۔ مسند احمد: حدیث: ۱۳۳

۱۵۔ ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ: ۱۸/۱۔۱۹

۱۶۔ صحیح بخاری: الادب المفرد: ۵۳

۱۷۔ ابن جریر الطبری، تاریخ (مصطفیٰ البابی، مصر۔ ۱۹۶۷): ۴۴۶/۳

۱۸۔ کنز العمال: ۱۳۴/۳، ۱۳۹

۱۹۔ ابن سعد، طبقات: ۱۱۳/۴

۲۰۔ مسند احمد: ۶/۱

۲۱۔ تاریخ طبری: ۲ /۲۷۴۷

البلاذری، فتوح البلدان (نفیس اکیڈمی۔ کراچی، ۱۹۸۶ء) :۶: ۲۷

ابن اثیر، الکامل: ۷۴/۳۔ ۷۵

ابن سعد، طبقات: ۲۸/۳

۲۲۔ ابن اثیر، الکامل: ۴۱۸/۲

۲۳۔ تاریخ طبری: ۲۹۲۸، تاریخ ابن کثیر: ۴/۸، ۵، بیہقی، السنن الکبریٰ: ۱۳۶/۱۰

۲۴۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان (مکتبہ النہضہ المصریہ، قاہرہ ۱۹۴۸ء): ۱۶۸/۲

۲۵۔ تاریخ طبری: ۵۵۰/۳، کنز العمال: ۱۷۴۷/۳

۲۶۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان: ۱۶۸/۲

۲۷۔ شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۵۷ء): ۷۳-۱۷۲

۲۸، ۲۹۔ تاریخ طبری: ۲۷۳/۳

۳۰۔ سید مودودی، خلافت وملوکیت (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۸۸ء): ۱۰۱-۱۰۰

۳۱۔ ابو یوسف، کتاب الخراج: ۲۱، ۲۷

۳۲۔ تاریخ طبری: ۲۶۴/۳، ابن سعد: ۴۴/۳۔ ۳۴۰

۳۳۔ تاریخ طبری: ۲۴۰۴/۳

۳۴۔ ابن اثیر، الکامل: ۳۳/۳، ابن سعد، طبقات: ۲۴۹/۳۔

۳۵۔ تاریخ طبری: ۲۶۳/۲